یہ دنیا وہ دنیا

اس مادی دنیا میں ہمارا ہر عمل ایک نتیجہ تخلیق کرتا ہے۔ ہم چلیں گے تو آگے بڑھیں گے۔ بوئیں گے تو کاٹیں گے۔ کھائیں گے تو سیر ہوں گے۔ پئیں گے تو پیاس بجھے گی۔ بولیں گے تو سنے جائیں گے۔ محنت کریں گے تو اسباب دنیا جمع کرتے چلے جائیں گے۔

مگر اس دنیا میں ایمانی عمل کوئی مادی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ بعض اوقات الٹا نتیجہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک بندہ مومن اس طرح تڑپ کر خالق ارض وسما کی حمد کرتا ہے کہ پہاڑ و پرند اس کے ساتھ حمد کرنے لگتے ہیں، مگر وہ گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن کر دیا جاتا ہے۔ ایک دیانت دار شخص کرپشن کی دلدل میں گھرے ہو کر بھی خود کو آلودہ نہیں کرتا، مگر اس کی ایمانداری اس کے لیے قیمتی پلاٹ اور عالیشان گھر نہیں تخلیق کر دیتی۔ ایک باحیا لڑکی اپنی شرافت کا بھرم رکھتی ہے، مگر حسن پرستی کے اس دور میں اپنا گھر اس کے لیے خواب وخیال ہو جاتا ہے۔

وہ قدریں جن کے بغیر انسانیت شرف انسانیت سے محروم ہو جائے گی وہ اس مادی دنیا میں آخری درجے میں غیر موثر ہیں۔ اس سے زیادہ حوصلہ پست کر دینے والی کوئی حقیقت اس مادی دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ ایسے میں خدا کی کتاب ہے جو یہ بتاتی ہے کہ یہ مادی دنیا ایک روز کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی اور ہر مادی عمل فنا ہو جائے گا۔

پھر ایک نئی دنیا تخلیق ہوگی۔ اس دنیا میں خدا کی محبت اور خوف میں بہنے والا ہر آنسو ستاروں اور کہکشاؤں کی بادشاہی تخلیق کر دے گا۔ فحش کو دیکھ کر جھک جانے والی نگاہ حسن کے جلووں کی ابدی تماشائی بنا دی جائے گی۔ اپنی نسوانیت کو مجمع میں ابھارنے کے بجائے چھپانے والی حیا جمال وکمال کے آخری قالب میں ڈھال دی جائے گی۔ ایمان، رحم، انفاق، صبر اس روز وہ چیک بکس بن جائیں گے جن سے جنت کا ہر محل اور ہر نعمت خریدی جاسکے گی۔

یہ مادی دنیا اور اس کا ہر عمل فانی ہے۔ وہ ایمانی دنیا ابدی ہے۔ اس کی ہر نعمت لازوال ہے۔

میاں بیوی اور دوستی

ہمارے معاشرے میں نوجوان شادی شدہ جوڑوں میں طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے۔ جہاں اس کے اور کوئی اسباب ہیں وہیں اس کا سبب اس بات کو نہ جاننا ہے کہ میاں بیوی کا تعلق دوستی اور برابری کا نہیں بلکہ محبت اور موافقت کا تعلق ہوتا ہے۔

میاں بیوی کے تعلق اور دوستی کے تعلق میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوست اپنے ذوق کے مطابق بناتا ہے۔ کسی بھی دو افراد کا ذوق سو فیصد ایک سا نہیں ہوسکتا۔ لیکن دوستی کے رشتے میں یہ حقیقت اس لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی کہ انسان اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی مرضی اور موڈ کے مطابق وقت گزارتا ہے اور جب دل چاہے اپنے گھر کی راہ لے سکتا ہے۔

جبکہ میاں بیوی ایک ہی گھر میں ہمہ وقت ساتھ رہتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کے ذوق، عادات، رویے اور سوچ کے تمام فرق کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ایسے میں نبھا کی ایک ہی شکل ممکن ہے کہ دونوں فریق کچھ نہ کچھ ایڈجسٹ کریں۔ یہ ایڈجسٹمنٹ عین عدل وانصاف کی بنیاد پر ففٹی ففٹی کے تناسب سے نہیں ہوسکتا۔ حقیقت پسند لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ زیادہ تر حالات میں شادی کے ابتدائی پانچ سات برسوں میں کم یا زیادہ بیوی ایڈجسٹ کرتی ہے جبکہ باقی ساری زندگی کم یا زیادہ مرد ایڈجسٹ کرتا رہتا ہے۔

یہ ایڈجسٹمنٹ یا موافقت برابری کی بنیاد پر نہیں بلکہ محبت کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ جبکہ دوستی ہر حال میں برابری کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہ برابری اگر ممکن نہیں تو دوستی ختم ہوجاتی ہے۔ مگر دوستی ختم ہونے سے زیادہ فرق اس لیے نہیں پڑتا کہ انسان کو اور دوست مل جاتے ہیں۔ جبکہ میاں بیوی کی علیحدگی ایک گھر کے ٹوٹنے اور بچوں کے برباد ہوجانے کا نام ہے۔ اسی لیے میاں بیوی کو برابری اور دوستی کے بجائے محبت اور موافقت کے اصول پر زندگی گزارنی چاہیے۔

پائلٹ، سرجن اور لیڈر

ایک مغربی مصنف کے مطابق امریکہ میں بہت سے مریض آپریشن کے وقت صرف اس وجہ سے مر جاتے ہیں کہ سرجن اس چیک لسٹ کو نہیں سنتے جو ان کے اسسٹنٹ آپریشن سے قبل تمام ضروری احتیاطی اقدامات کے حوالے سے ان کو سناتے ہیں۔اس کے برعکس ہوائی جہاز کے پائلٹ ایسی چیک لسٹ کو پوری توجہ سے سنتے ہیں اور ان کے مطابق جہاز اڑانے سے قبل اپنی تیاری کا جائزہ لیتے ہیں۔مصنف کے مطابق اس کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ پائلٹ سے یہ باتیں اس کا افسر پوچھتا ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس جہاز میں خود پائلٹ سوار ہوتا ہے اور جہاز گرنے کی صورت میں پائلٹ بھی مرتا ہے جبکہ آپریشن ناکام ہونے پر صرف مریض مرتا ہے؛ سرجن کو کچھ نہیں ہوتا۔

سرجن اور پائلٹ دونوں ایک نوعیت کے لیڈر ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں دوسروں کی تقدیر ہوتی ہے۔مگر جس لیڈر کا ذاتی مفاد خطرے میں ہو وہ بہت سنجیدگی سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتا ہے اور جس لیڈر کا ذاتی مفاد خطرے میں نہ ہو اس کی حساسیت کس طرح کم ہو جاتی ہے۔

پاکستانی قوم کا ایک اہم بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کے لیڈروں کے ذاتی مفادات کا اجتماعی مفادات سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ان کی ناکامی سے ان کی ذاتی زندگی، معاشی حالات اور معاشرتی قد کاٹھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔چنانچہ وہ ناکام ہوتے ہیں اور اطمینان کے ساتھ اقتدار سے رخصت ہو کر مزے کی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔

پاکستانی قوم نے الیکشن کرانے کا مرحلہ طے کر لیا ہے۔اب اسے دوسری چیز سیکھنی ہے۔یہ ہے لیڈروں کا احتساب۔ضروری ہے کہ ہر لیڈر اقتدار سے رخصت ہوتے وقت اپنے معاملات کا حساب دے اور ہر جرم کی سزا بھگتے۔یہ نہیں ہوگا تو قوم اسی طرح خوار و خراب ہوتی رہے گی۔ اور لیڈر ایک کے بعد ایک اقتدار کے مزے لوٹ کر مزے سے اپنے گھروں کو لوٹتے رہیں گے۔

ایمان، حج اور جہاد

ذوالحجہ کا مہینہ حج کا مہینہ ہے۔ یہ عظیم عبادت جو اسلام کے بنیادی اراکین میں سے ایک رکن ہے، زندگی میں ہر صاحب استطاعت مسلمان پر ایک دفعہ فرض ہے۔ امام بخاری اپنی صحیح کی کتاب الایمان میں ایک روایت لائے ہیں جو اس بات کا بہترین بیان ہے کہ دین اسلام میں حج کی کیا اہمیت ہے:

''حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل افضل ہے۔ فرمایا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ کہا پھر کون سا عمل؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد۔ پھر پوچھا گیا پھر اس کے بعد تو فرمایا: حج مبرور۔''، (بخاری، رقم: 26)

یہ حج مبرور کیا ہے اس کو ایک دوسری روایت میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

''جو شخص اللہ کے لیے حج کرے، پھر اُس میں کوئی شہوت یا نافرمانی کی بات نہ کرے تو وہ حج سے اِس طرح لوٹتا ہے، جس طرح اُس کی ماں نے اُسے آج جنا ہے۔''، (بخاری، رقم: 1819)

اس حج مبرور کا بدلہ ایک روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

''عمرے کے بعد عمرہ اِن کے درمیان میں ہونے والے گناہوں کے لیے کفارہ ہے اور سچے حج (حج مبرور) کا بدلہ تو صرف جنت ہی ہے۔''(بخاری، رقم: 1773)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے حج دین ابراہیمی کی سب سے جامع عبادت ہے جسے تمام عبادات کا منتہائے کمال کہنا کوئی مبالغہ نہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کوئی عالم ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر وہ شخص جس نے زندگی میں یہ سعادت حاصل کر رکھی ہو وہ اپنے تجربے سے اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بندہ مومن صرف اللہ پر ایمان

اوراس کے رسول کے طریقے پر اپنی جان پر دکھ جھیلتا، مال کوخرچ کرتا، گھر، وطن اور رشتے ناطوں کی دوری سہتا، احرام کی سخت پابندیاں خود پر لگا تا ہوا صرف اللہ کی رضا کے لیے اس کے گھر پر حاضر ہوتا اور مناسک حج ادا کرتا ہے۔ یہی وہ قربانی ہے جو ایمان اور جہاد کے بعد حج مبرور کو سب سے بڑا عمل بنا دیتی ہے۔

تاہم ان سب کے ساتھ حج کو حج بنانے والی چیز یہ حقیقت ہے کہ حج دراصل جہاد کی تمثیل ہے۔ یہ اس جنگ کی تمثیل ہے جس کا اعلان روز ازل شیطان نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ لاغوینھم اجمعین یعنی میں ان سب کو گمراہ کر کے دم لوں گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی شیطان اور ذریت شیطان کی آدم اور اولاد آدم کے ساتھ ختم نہ ہونے والی جنگ شروع ہوگئی۔ بدقسمتی سے ہر دور میں انسانوں کی اکثریت اس جنگ میں اپنے باپ آدم علیہ السلام کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے شیطان کے ساتھ جا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس کی طرف سے جنگ شروع کر دیتی ہے۔ ایسے میں ایمان کا قلادہ گلے میں ڈالے اور اطاعت کا عہد کیے ہوئے سچے مسلمان خدا کی طرف جنگ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ خواہشات کے تیروں اور شہوات کے شیطانی نیزوں کا مقابلہ صبر کی آہنی ڈھال سے اور تعصّبات کی ہر فصیل کو حق پرستی اور سچائی کی تلوار سے فتح کر لیتے ہیں۔ حج ایسے ہی لوگوں کے لیے گویا ایک تربیتی کورس ہے۔

یہ مومن ابراہیمی صدا پر لبیک کہتے اور دنیوی زیب وزینت اور لطافت کو ترک کر کے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا پہلا پڑاؤ منیٰ کے فوجی کیمپ میں ہوتا ہے۔ پھر عرفات میں امام کے خطبے کی شکل میں لشکر کشی سے پہلے وعظ ونصیحت اور اللہ سے دعا وزاری کا اہتمام ہوتا ہے۔ سفر جہاد کی تمثیل میں نمازیں جمع وقصر کرتے ہوئے یہ لشکر مزدلفہ پہنچتا۔ اور صبح دم اپنے رب کو یاد کرتا ہوا غنیم پر جا پڑتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جسے مناسک حج کی اصطلاح میں رمی

جمار یا شیطان کو کنکریاں مارنے کا عمل کہتے ہیں۔ اس پہلے حملے کے ساتھ ہی قربانی دے کر خود کو رب کی راہ میں قربان کر دینے کا عزم کرتے، سرمنڈوا کر اس کا شرف غلامی حاصل کرتے اور اس کے گھر کا طواف کر کے اس کو مرکز زندگی بنا کر اپنی زندگی گزارنے کا عزم کرتے ہیں۔

پہلے دن صرف پہلے بڑے شیطان پر اور اگلے دو یا تین دن تک تینوں شیطانوں پر یہ مومنانہ سنگ باری حملے جاری رہتے ہیں۔ یہ تین شیطان بھی دراصل ان تین چیزوں کی علامت ہیں جہاں سے انسان سب سے زیادہ گمراہ کیا جاتا ہے۔ پہلا ابلیس اور اس کی ذریت۔ یہ سب سے بڑی شیطانی قوت ہے۔ دوسری انسان کا اپنا نفس جو اگر خود پر غالب آ جائے تو شیطان کا سب سے بڑا ساتھی بن جاتا ہے۔ تیسرا انسان کا ماحول اور اس میں پائی جانے والی شیطانی ترغیبات۔ یہی وہ تین مقامات ہیں جہاں انسان کو زندگی بھر شیطانی وسوسہ انگیزیوں کے خلاف لڑتے رہنا ہوتا ہے۔ اس سنگ باری کے بعد یہ مجاہد اس عزم کے ساتھ گھروں کو لوٹتے ہیں کہ زندگی بندگی میں گزرے گی اور شیطان کا ازلی چیلنج پورا نہیں ہوگا کہ خدا بندے کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

بدقسمتی سے دور حاضر میں لوگ بڑی تعداد میں حج کرنے تو جاتے ہیں، مگر انہیں حج کی یہ حقیقی اسپرٹ نہیں بتائی جاتی۔ چنانچہ وہ اسے مناسک کا ایک مجموعہ سمجھ لیتے ہیں جسے برے بھلے طریقے پر ادا کر دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ مالی اور بدنی طور پر قربانی دے کر جب حج کیا جائے تو اس کا اپنی جگہ بڑا اجر ہے، مگر جب لوگ اسپرٹ سے واقف نہیں ہوتے تو پھر ان کی زندگی میں وہ حقیقی اسپرٹ پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اکثر اوقات اسے گناہ بخشوانے کا ایک سفر سمجھتے ہیں اور واپس آ کر وہی شیطان کی پیروی کی زندگی گزارنے لگتے ہیں جیسی وہ پہلے گزار رہے تھے۔

لیکن اسپرٹ اگر بار بار دہرائی جائے تو انسان کا حج صرف ایک سفر نہیں رہتا بلکہ یہ زندگی کا ایک نیا آغاز بن جاتا ہے۔ وہ آغاز جس کی آج ہمارے معاشرے کو سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔

اپنی جاگیر

پچھلے دنوں ادارہ انذار کے ذمے داروں کا ایک اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں اپنے رفقا سے میں نے یہ عرض کیا کہ میں نے یہ ادارہ ابویحییٰ کے کاموں کے فروغ کے لیے نہیں بنایا۔ اس لیے اس ادارے کو میرے لیے نہیں بلکہ معاشرے میں سچے ایمان اور اس کے بنیادی تقاضے یعنی اعلیٰ اخلاقیات کے فروغ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ ہمیں معقولیت، صبر، مثبت اندازِ فکر جیسی اقدار کے لیے کام کرنا چاہیے نہ کہ کسی فرد یا شخصیت کے لیے۔ ایمان، اخلاق اور اعلیٰ اقدار کے فروغ کے لیے جو بھی کام کر رہا ہو، آپ بلاتعصب اس کا کام آگے پھیلائیں۔ اس لیے کہ بندہ مومن کی اصل وابستگی تو اللہ اور اس کے رسول سے ہونی چاہیے نہ کہ کسی انسان سے۔

مذہبی اداروں اور تنظیموں کا یہ بنیادی المیہ ہے کہ ان کے دستور میں جو کچھ بھی لکھا ہے، عملی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ لوگ عملاً کسی خاص شخصیت کے گرد ہی گھومتے رہتے ہیں۔ وہ شخصیت مر جاتی ہے تو اس کا تخلیق کردہ لٹریچر اور اسی کے مطابق ڈھلی ہوئی شخصیات اس کی جگہ لے لیتی ہیں۔ یہی چیز کچھ عرصے میں سخت قسم کے گروہی تعصّبات اور نفرت و عداوات پھیلانے کا سبب بن جاتی ہے۔

یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی بڑا عالم یا داعی کسی کام کا آغاز کرتا ہے۔ لوگ اس عالم اور اس کے کام سے متاثر ہو کر اس کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ خود ہی نہیں آتے بلکہ اپنے ساتھ ہر طرح کا عملی اور مالی تعاون ساتھ لاتے ہیں۔ اب اس شخصیت، ادارے اور تنظیم کا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ جو لوگ آ گئے ہیں وہ کہیں اور نہ جائیں۔ یہ لوگ گویا کہ اس فرد یا ادارے کی جاگیر ہوتے ہیں جسے ہر قیمت پر اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اب ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنی بات کو آخری حق اور اپنے کام کو دین کے واحد مطلوبہ کام کے

طور پر پیش کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں پر تنقید کر کے ان کی صرف خامیاں نکال کر انہیں غیر معتبر بنانا بھی اس کام کا لازمی حصہ بن جاتا ہے۔ کوئی اور آدمی اگر اپنے کچھ لوگوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ ہمارے عتاب اور غیض وغضب کا نشانہ بن جاتا ہے۔ پھر اسے فتنہ قرار دے کر اس کی بیخ کنی کی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سارے کام دین کے نام پر ہو رہے ہوتے ہیں اور عین ممکن ہے یہ سب کرنے والے خلوص دل سے اسے دینی خدمت سمجھ کر کرتے ہوں۔ مگر عملاً یہ مفادات کی جنگ ہوتی ہے جو تھوڑے عرصے میں وہ تعصّبات کی جنگ بن جاتی ہے۔ یہ رویہ معاشرے میں بدترین فرقہ واریت، نفرت اور دہشت کا ماحول جنم دیتا ہے۔ پھر وہی کچھ ہوتا ہے جو اس وقت ہمارے معاشرے میں مذہب کے نام پر ہو رہا ہے۔

مگر یہ رویہ سب تا سب ایک غلط رویہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں یہ حق صرف اور صرف اللہ کے رسولوں کو حاصل ہے کہ وہ یہ کہنے کی جرات کریں کہ من انصاری الی اللہ۔ یعنی کون راہ خدا میں میرا مددگار ہے۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ذات عین حق ہوتی ہے۔ باقی سارے لوگ عام انسان ہیں۔ وہ غیر معصوم ہیں۔ ان کی ہر رائے غلط اور ہر فہم باطل ہو سکتا ہے۔

وہ یقیناً معاشرے میں کام کریں گے، مگر اپنے کام اور نقطہ نظر کو آخری حق کے طور پر نہیں پیش کر سکتے۔ وہ لوگوں میں اپنی بات بیان کریں گے، مگر انہیں اس بات کی پوری اجازت دیں گے کہ وہ دوسروں کی چیزیں پڑھیں اور جس کی بات درست لگے اسے مان لیں۔ انہیں کسی نقطہ نظر پر تنقید کا حق حاصل ہے، مگر الزام و بہتان کی بنیاد پر کسی دوسرے فرد کو فتنہ قرار دے کر مہم چلانے کا حق کسی صورت حاصل نہیں۔ انہیں لوگوں کو ساتھ ملانے کا حق بلاشبہ حاصل ہے، مگر انہیں اپنی جاگیر سمجھ کر ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنا ذہنی لونڈی غلام بنانے کا حق بالکل نہیں۔

یہ رویہ غلط ہے، غلط ہے، ہر حال میں غلط ہے۔ اگر کوئی عالم یہ جان بوجھ کر کر رہا ہے تو وہ بدترین مجرم ہے۔ اگر وہ انجانے میں یہ سب کر رہا ہے تب بھی ایک بڑی خطا کا ارتکاب کر رہا ہے۔ کیونکہ جلد ہی وہ تعصّبات کو حق سمجھ کر اور ان کی بنیاد پر دوسروں کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ مہمیں چلا کر اپنی ساری نیکیاں گنوا دے گا۔ جس کے بعد سوائے قیامت کی ذلت و رسوائی کے کچھ نہیں بچے گا۔

اگر عام لوگ اس طرح کے ذہنی لونڈی غلام جان بوجھ کر بن رہے ہیں تو وہ قیامت کے دن اجر کے بجائے خدا کی ناراضی کا سامنا کریں گے۔ اگر انجانے میں کر رہے ہیں تو جلد ہی وہ الزام و بہتان کی کسی مہم کا حصہ بن کر خدا کے قہر کی زد میں آ جائیں گے۔ جس کے بعد روز قیامت کی حسرت اور ندامت کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔

''بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر چھوڑی ہے اور ان کے لیے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ جس میں ان کے چہرے آگ میں الٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے: کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہمیں راہ سے بھٹکا دیا۔: اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بھاری لعنت کر!''، (احزاب 33:64-68)

ابو یحییٰ

اسلام اور لونڈیاں

مجھ سے مختلف حوالوں سے بار بار یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اسلام میں لونڈیوں کا کیا تصور ہے۔ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں اگر ان کا ذکر آگیا ہے تو قرآن مجید کے احکام کی ابدی نوعیت کے پیش نظر ان سے تمتع کرنا (جنسی تعلق قائم کرنا) ابھی بھی جائز ہونا چاہیے۔ بلکہ عملی طور پر بہت سے لوگ آج بھی گھریلوں خادماؤں سے یا بے سہارا لڑکیوں کو اپنے پاس رکھ کر اسی بنیاد پر ان سے تعلق قائم کرتے ہیں۔اس کے ردعمل میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ لونڈیاں بھی منکوحہ بیویاں ہی ہیں۔مگر ظاہر ہے کہ قران مجید کے کئی بیانات اس بات کی باصراحت نفی کرتے ہیں اس لیے یہ استدلال بالکلیہ رد کر دیا جاتا ہے۔آج انشاءاللہ میں اسی نوعیت کے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

دو قسم کے احکام

اس معاملے میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس حوالے سے بیان ہونے والے احکامات کی نوعیت کو درست طور پر سمجھا جاتا ہے نہ بیان کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن مجید میں مرد وزن کے تعلق کے حوالے سے دو طرح کے احکام پائے جاتے ہیں۔ایک احکام وہ ہیں جو نزول قرآن کے وقت رائج حالات کے پس منظر میں ہیں۔دوسرے احکام وہ ہیں جو بطور ابدی شریعت کے دیئے گئے ہیں۔

پہلی قسم کے احکام وہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے معاشرے میں لونڈیوں کی موجودگی کے باوجود ان سے تمتع کرنے کی اجازت دی تھی۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ نزول قرآن کے

وقت گھر گھر لونڈیاں موجود تھیں۔مگر اس کے باوجود قرآن مجید جب نازل ہوا تو اس نے لوگوں کو میاں بیوی کا تعلق قائم کرنے سے نہیں روکا اور اس حوالے سے کوئی قانونی ممانعت ہمیں نظر نہیں آتی۔ان قرآنی بیانات کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

مکی دور کی دو سورتوں (معارج ۷۰: ۳۰ ،مومنون ۲۳: ۶) میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا (کنیزوں سے) جو ان کی مِلک ہوتی ہیں کہ (ان سے) مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے) نکل جانے والے ہیں۔"

یہ اس ضمن کی صریح ترین آیت ہے کہ بیویوں کے علاوہ لونڈیوں سے تعلق قائم رکھنے کو قرآن نے اپنے نزول کے وقت ہرگز نہیں روکا تھا۔یہی صورتحال ہجرت مدینہ کے بعد رہی۔ جنگ احد میں جب بہت سے مسلمانوں کی شہادت ہوگئی اور ہر دوسرے گھر میں بیواؤں اور یتیموں کا مسئلہ پیدا ہوا تو قرآن مجید نے اس موقع پر عرب کے ایک اور رواج یعنی دوسری شادی کو بطور حل پیش کیا۔مگر ایک سے زیادہ شادیوں میں یہ شرط لگادی کہ چار سے زیادہ شادیاں نہ ہوں۔ساتھ ہی تعدد ازواج کو عدل سے مشروط کردیا۔ پھر فرمایا کہ اگر بیویوں میں عدل نہ کر سکو تو پھر ایک سے زیادہ بیوی نہیں کر سکتے ،ہاں لونڈیوں سے تمتع البتہ جائز ہے۔ارشادی باری تعالیٰ ہے:

"اور اگر ڈر ہو کہ ان (بیویوں) کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو، یا پھر لونڈیاں جو تمھاری ملک میں ہوں"، (النساء ۴: ۳)

پچھلی آیات کی طرح یہاں بھی بیوی کے ساتھ علیحدہ سے لونڈی کا ذکر یہ واضح کرتا ہے کہ جو لونڈیاں اس وقت موجود تھیں قرآن نے ان سے مقاربت کو جائز قرار دیا تھا اور بیویوں کی طرح اس کے لیے نکاح کے کسی تعلق کو لازم قرار نہیں دیا تھا۔

اس ضمن میں قرآن مجید میں آخری آیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ہے جس

میں آپ کو تعدد ازواج اور عدل کی مذکورہ بالا شرائط سے آزاد قرار دیا گیا ہے جن کی پابندی عام مسلمانوں کے لیے ضروری تھی۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اے پیغمبر ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیے ہیں حلال کر دی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو اللہ نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمہارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں جو تمہارے ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں (سب حلال ہیں) اور کوئی مومن عورت اگر اپنے تئیں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لیے بغیر نکاح میں آنا چاہے) بشرطیکہ پیغمبر بھی ان سے نکاح کرنا چاہیں (وہ بھی حلال ہے لیکن) یہ اجازت خاص تم ہی کو ہے سب مسلمانوں کو نہیں۔ہم کو معلوم ہے جو کچھ ہم نے ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں فرض کیا ہے۔(یہ) اس لیے (کیا گیا ہے) کہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہ رہے۔اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(اور تم کو یہ بھی اختیار ہے کہ) جس بیوی کو چاہو علیحدہ رکھو اور جسے چاہو اپنے پاس رکھو۔اور جس کو تم نے علیحدہ کر دیا ہو اگر اس کو پھر اپنے پاس طلب کر لو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ یہ (اجازت) اس لیے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمناک نہ ہوں اور جو کچھ تم ان کو دو اسے لے کر سب خوش رہیں۔اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اسے جانتا ہے۔اور اللہ جاننے والا اور بردبار ہے

(اے پیغمبر) ان کے سوا اور عورتیں تم کو جائز نہیں اور نہ یہ کہ ان بیویوں کو چھوڑ کر اور بیویاں کرو خواہ ان کا حسن تم کو (کیسا ہی) اچھا لگے مگر وہ جو تمہاری مملوکہ ہوں۔اور اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔“ (الاحزاب ۳۳: ۵۰۔ ۵۲)

اس آخری آیت میں جو پابندی لگائی ہے کہ اس متعین دائرے سے باہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے لیے کوئی عورت حلال نہیں، اس میں بھی استثنا صرف لونڈیوں کا ہے کہ نکاح کے بغیر بھی آپ ان کو رکھ سکتے تھے۔

ان احکام و بیانات میں یہ بات واضح ہے کہ لونڈیوں سے تمتع کرنے کی اجازت علی الاطلاق بغیر کسی نکاح کے معاہدے کے صرف اس دور کے رواج کی بنا پر دی گئی ہے جس کے تحت ایک مرد کے لیے یہ جائز تھا کہ وہ محض حق ملکیت کی بنا پر لونڈی سے تعلق قائم کرے، جس طرح وہ نکاح کر کے ایک آزاد عورت سے تعلق قائم کر سکتا تھا۔

ابدی احکام

مرد و زن کے تعلق کے حوالے سے دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جو قرآن مجید کی ابدی شریعت کا حصہ ہیں۔ ان احکام میں قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ مرد و زن کس بنیاد پر باہمی تعلق قائم کر سکتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان مقامات پر صرف نکاح کے رشتے کا ذکر کر کے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ صرف یہی وہ تعلق ہے جس کی بنیاد پر ایک مرد و عورت مقاربت کر سکتے ہیں۔ ان مقامات پر لونڈیوں کا ذکر کیا ہی نہیں گیا اور جہاں کیا گیا ہے وہاں یہ ذکر نکاح کے حوالے سے ہے۔ یہ احکام درج ذیل ہیں۔

> ''اور مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرنا۔ ایک مومن لونڈی ایک (آزاد) مشرکہ سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں بھلی لگے۔ اور مشرکوں کو جب تک وہ ایمان نہ لائیں (اپنی عورتیں) نکاح میں نہ دو۔ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے۔ اگرچہ وہ تمھیں بھلا لگے''، (بقرہ ۲: ۲۲۱)

یہ نکاح کے حوالے سے قرآن کا ایک اہم حکم ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کسی مشرک مرد یا عورت سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ نکاح کے لیے ایک آزاد مشرک عورت سے

مومن لونڈی بہتر ہے۔ یہی معاملہ مومن غلام کا ہے کہ آزاد مشرک مرد سے بہتر ہے کہ ایک مومن غلام سے نکاح کا تعلق قائم ہو۔

سورہ مائدہ میں جب دین کا اتمام ہو رہا تھا اور شریعت کے آخری اور فیصلہ کن احکام دیے جا رہے تھے تو وہاں اس حکم میں ایک رعایت یہ دی گئی کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ دیکھیے اس موقع پر لونڈیوں کا ذکر بالکل حذف کر دیا گیا ہے۔

"آج تمہارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں ہیں......اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن اہل کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جبکہ ان کا مہر دے دو"، (مائدہ ۵:۵)

مرد و زن کے تعلق کے ضمن میں بنیادی آیت سورہ نساء کی درج ذیل آیات ہیں۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن خواتین سے نکاح حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور رضاعی بہنیں اور ساسیں حرام کر دی گئی ہیں اور جن عورتوں سے تم مباشرت کر چکے ہو ان کی لڑکیاں جنہیں تم پرورش کرتے (ہو وہ بھی تم پر حرام ہیں) ہاں اگر ان کے ساتھ تم نے مباشرت نہ کی ہو تو (ان کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح کر لینے میں) تم پر کچھ گناہ نہیں اور تمہارے صلبی بیٹوں کی عورتیں بھی اور دو بہنوں کا (ایک رشتہ نکاح میں) اکٹھا کرنا بھی (حرام ہے) مگر جو ہو چکا (سو ہو چکا) بے شک اللہ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

اور شوہر والی عورتیں بھی (تم پر حرام ہیں) مگر وہ جو (اسیر ہو کر لونڈیوں کے طور پر) تمہارے قبضے میں آ جائیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے جس کی پابندی لازمی ہے۔ اور ان (محرمات) کے سوا اور عورتیں تم کو حلال ہیں اس طرح سے کہ مال خرچ کر کے ان سے نکاح کر لو......

اور جو شخص تم میں سے مومن آزاد عورتوں (یعنی بیبیوں) سے نکاح کرنے کا مقدور نہ

رکھے تو مومن لونڈیوں میں ہی جو تمہارے قبضے میں آ گئی ہوں (نکاح کر لے) اور اللہ تمہارے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے تم آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہو تو ان لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کر دو۔''، (نساء۴: ۳۲۔ ۵۲)

اس آیت میں دو جگہ لونڈیوں کا ذکر ہے اور دونوں جگہ نکاح کے حوالے سے۔ یعنی اگر کوئی آزاد شادی شدہ عورت بطور لونڈی جنگ میں ہاتھ آ جائے تو پھر اسے نئے نکاح کے لیے پچھلے شوہر سے طلاق کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا سابقہ نکاح کالعدم تصور ہوگا۔ اسی طرح آگے وضاحت کی گئی ہے کہ ایک لونڈی سے اس کے مالک کی اجازت سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کے یہی وہ مقامات ہیں جن میں مرد و زن کے تعلق کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان کے سرسری مطالعے سے بھی یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت جس کے احکام قیامت تک کے لیے ہیں جب مرد و زن کے تعلق کو موزوں بناتی ہے تو صرف اور صرف نکاح کو اس کی بنیاد ٹھہراتی ہے۔ لونڈی کی ملکیت یا کسی اور بنیاد پر مرد و زن کے تعلق کی کوئی اسلام کے ابدی احکام میں نہیں۔

قرآن اور غلامی

اسلامی شریعت کے اس مدعا کی وضاحت کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا سبب ہے کہ قرآن مجید نے اپنے نزول کے وقت لونڈیوں کے ساتھ مقاربت کو جائز قرار دیا۔ کیوں نہ ایسا ہوا کہ ایک حکم کے ذریعے سے لونڈی غلاموں کا رکھنا ہی حرام قرار دے دیا جاتا۔ اس کے برعکس نہ صرف پہلی قسم کے احکام قرآن میں پائے جاتے ہیں جن میں لونڈیوں سے مقاربت کی اجازت ہے بلکہ متعدد مقامات پر لونڈی غلاموں کا ذکر خادموں کی حیثیت سے بھی ہے۔ کیا واقعی ان احکام و بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید غلامی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ کیا یہ واقعی اس کی منشا تھی کہ مسلمان جنگیں کر کے دوسرے لوگوں کو لونڈی غلام بنائیں۔ دنیا بھر سے معصوم بچے،

بچیوں اور بڑوں کو حضرت یوسف کی طرح اغوا کیا جائے اور مسلمانوں کے بازاروں میں ان کی نیلامی ہو۔ مسلمانوں کے غلام ان کے کھیت اور کارخانوں کو چلا رہے ہوں اور لاتعداد لونڈیاں ان کے حرم میں سامان عیش کے طور پر موجود ہوں۔

ہم پورے اطمینان اور اعتماد سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کی ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں تھی۔ قرآن مجید نے نہ لوگوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور نہ ایسا کوئی حکم کبھی دیا گیا۔ ہم پھر اس بات کو دہرانا چاہیں گے کہ قرآن مجید نے نہ لوگوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور نہ ایسا کوئی حکم کبھی دیا گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ غلامی کی لعنت ہزاروں برس سے انسانی معاشروں میں موجود تھی۔ قرآن مجید قطعی طور پر اس لعنت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس مقصد کے لیے اسلام نے انقلابی طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ایک حکم سے ساری لونڈی غلاموں کو آزاد قرار دے دیا جائے۔

انقلابی تبدیلیوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جہاں ایک برائی کو ختم کرتی ہیں وہاں دس نئی برائیوں کو جنم دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام نے برائیوں کے خاتمے کے لئے بالعموم انقلاب (Revolution) کی بجائے تدریجی اصلاح (Evolution) کا طریقہ اختیار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غلاموں کی حیثیت بالکل آج کے زمانے کے ملازمین کی تھی جن پر پوری معیشت کا دارومدار تھا۔ غلامی کے خاتمے کی حکمت عملی کو سمجھنے کے لیے اگر درج ذیل مثال پر غور کیا جائے تو بات کو سمجھنا بہت آسان ہو گا۔ خیال رہے کہ ہم اس مثال میں ملازمت کو غلامی جیسی برائی قرار نہیں دے رہے، بلکہ حکمت عملی کے پہلو سے ایک ایسی مثال پیش کر رہے ہیں جسے آج کا انسان بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

ملازمت کی مثال

موجودہ دور میں بہت سے مالک (Employers) اپنے ملازمین کا استحصال کرتے

ہیں۔ ان سے طویل اوقات تک بلا معاوضہ کام کرواتے ہیں، کم سے کم تنخواہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، بسا اوقات ان کی تنخواہیں روک لیتے ہیں، خواتین ملازموں کو بہت مرتبہ جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ ایک مصلح ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دنیا سے ملازمت کا خاتمہ ہو جائے اور تمام لوگ آزادانہ اپنا کاروبار کرنے کے قابل ہو جائیں۔ آپ نہ صرف ایک مصلح ہیں، بلکہ آپ کے پاس دنیا کے وسیع و عریض خطے کا اقتدار بھی موجود ہے اور آپ اپنے مقصد کے حصول کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

ان حالات میں آپ کا پہلا قدم کیا ہو گا؟ کیا آپ یہ قانون بنا دیں گے کہ آج سے تمام ملازمین فارغ ہیں اور آج کے بعد کسی کے لیے دوسرے کو ملازم رکھنا ایک قابل تعزیر جرم ہے؟ اگر آپ ایسا قانون بنائیں گے تو اس کے نتیجے میں کروڑوں بے روزگار وجود پذیر ہوں گے۔ یہ بے روزگار یقیناً روٹی، کپڑے اور مکان کے حصول کے لیے چوری، ڈاکہ زنی، بھیک اور جسم فروشی کا راستہ اختیار کریں گے۔ جس کے نتیجے میں پورے معاشرے کا نظام تلپٹ ہو جائے گا اور ایک برائی کو ختم کرنے کی انقلابی کوشش کے نتیجے میں ایک ہزار برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ملازمت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے تدریجی اصلاح کا طریقہ ہی کارآمد ہے۔ اس طریقے کے مطابق مالک و ملازم کے تعلق کی بجائے کوئی نیا تعلق پیدا کیا جائے گا۔ لوگوں میں یہ شعور پیدا کیا جائے گا کہ وہ اپنے کاروبار کو ترجیح دیں۔ انہیں کاروبار کرنے کی تربیت دی جائے گی۔ جو لوگ اس میں آگے بڑھیں، انہیں بلا سود قرضے دیے جائیں گے اور تدریجاً تمام لوگوں کو ملازمت کی غلامی سے نجات دلا کر مکمل آزاد کیا جائے گا۔

عین ممکن ہے کہ اس سارے عمل میں صدیاں لگ جائیں۔ ایک ہزار سال کے بعد، جب دنیا اس مسئلے کو حل کر چکی ہو تو ان میں سے بہت سے لوگ اس مصلح پر تنقید کریں اور یہ کہیں کہ

انہوں نے فوری طور پر ایسا کیوں نہیں کیا، ویسا کیوں کیا مگر اس دور کے انصاف پسند یہ ضرور کہیں گے کہ اس عظیم مصلح نے اس مسئلے کے حل کے لیے تدریج کا فطری طریقہ اختیار کیا تھا۔ اور ایسا نہ کیا جاتا تو معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا۔

اب اسی مثال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر منطبق کیجیے۔ اسلام غلامی کا آغاز کرنے والا نہیں تھا، بلکہ وہ اسے ورثے میں ملی تھی۔ اسلام کو اس مسئلے سے نمٹنا تھا۔ عرب میں بلا مبالغہ ہزاروں لونڈی غلام موجود تھے۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں کام کر رہے تھے۔ اگر ان سب غلاموں کو ایک ہی دن میں آزاد کر دیا جاتا تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلتا کہ ہزاروں کی تعداد میں طوائفیں، ڈاکو، چور، بھکاری وجود میں آتے جنہیں سنبھالنا شاید کسی کے بس کی بات نہ ہوتی۔ چنانچہ اسلام نے ایک تدریجی طریقے سے اس مسئلے کو حل کیا۔ اس ضمن میں جو اقدامات کیے گئے ان مین سے کچھ اہم یہ ہیں:

غلامی ختم کرنے کے اقدامات

۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو غلاموں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنے کی تربیت دی۔ انہیں یہ حکم دیا کہ جو تم خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ، جو خود پہنو، وہی انہیں پہناؤ اور ان کے کام میں ان کی مدد کرو۔ غلاموں کو اپنا بھائی سمجھو، ان کا خیال رکھو اور ان پر ظلم نہ کرو۔ اسی تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ اپنے غلاموں سے اچھا برتاؤ کرنے لگے اور ان کا معیار زندگی بلند ہو گیا۔ سیرت و روایات کے زخیرہ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور ان کے غلام کو دیکھ کر یہ پہچاننا مشکل تھا کہ آقا کون ہے اور غلام کون ہے۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا اپنے غلاموں سے بیٹوں کا سا سلوک کرتیں۔ وغیرہ۔

۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو اعلیٰ اخلاقی تربیت

دیں اور انہیں آزاد کر دیں ۔ لونڈیوں کو آزاد کرنے کے بعد ان سے شادی کرنے کو ایسا کام قرار دیا جس پر اللہ تعالیٰ کے حضور دوہرے اجر کی نوید ہے ۔ بعد کے دور میں ہمیں ایسے بہت سے غلاموں یا آزاد کردہ غلاموں کا ذکر ملتا ہے جو علمی اعتبار سے جلیل القدر علما صحابہ کے ہم پلہ تھے ۔ ایک مثال سیدنا سالم رضی اللہ عنہ تھے جن کا شمار ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے ۔

۔مثال قائم کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام غلام آزاد کیے یہاں تک کہ اپنی وفات کے وقت آپ کے پاس کوئی غلام نہ تھا ۔آپ کے جلیل القدر صحابہ کا بھی یہی عمل تھا ۔سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی دولت سے ایسے غلام خرید کر آزاد کیے جن پر ان کے مالک اسلام لانے کے باعث ظلم کرتے تھے ۔صحابہ کی تاریخ میں ایسے بہت سے غلاموں کا ذکر ملتا ہے جو آزاد کیے گئے تھے ۔ان کے حالات پر کئی کتابیں بھی لکھی گئیں جو کتب الموالی کہلاتی ہیں ۔

۔دور جاہلیت میں آزاد کردہ غلاموں کو بھی کوئی معاشرتی مقام حاصل نہ تھا ۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کے سابقہ مالکوں کا ہم پلہ قرار دیا ۔

۔ایسے غلام جو آزادی کے طالب تھے، ان کی آزادی کے لیے قرآن نے " مکاتبت " کا دروازہ کھولا ۔اس کے مطابق جو غلام آزادی کا طالب تھا، وہ اپنے مالک کو اپنی مارکیٹ ویلیو کے مطابق قسطوں میں رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتا تھا ۔صحابہ کرام ایسے غلاموں کی مالی مدد کرتے جو مکاتبت کے ذریعے آزاد ہونا چاہتے تھے ۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی بریرہ رضی اللہ عنہا کے مالک کو رقم ادا کر کے انہیں آزاد کروایا تھا ۔قرآن نے حکومتی خزانے میں سے ایسے غلاموں کی مالی امداد کا حکم دیا ہے ۔ یہ وہ حکم تھا جس نے تدریجی اور قانون طریقے سے غلامی کی لعنت کے خاتمے کی بنیاد رکھ دی ۔

۔غلامی کی سب سے بڑی جڑ جنگی قیدی تھے جن کو غلام بنایا جاتا تھا۔قرآن نے جنگی قیدیوں کے بارے میں یہ حکم دیا کہ یا تو انہیں بلا معاوضہ آزاد کردیا جائے یا پھر ان سے جنگی تاوان وصول کر کے آزاد کیا جائے۔اس طرح نئے غلام اور کنیزیں بننے کا سلسلہ رک گیا۔

ایک آخری سوال: غلامی ختم کیوں نہ ہوسکی

اس ضمن کا ایک آخری اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ ان تمام اقدامات کے بعد بھی مسلم معاشرے میں غلامی ختم کیوں نہ ہوسکی۔کیوں ایسا ہوا کہ بیسویں صدی تک عرب کے معاشرے میں لونڈی غلام بازاروں میں بکتے رہے؟

ہمارے نزدیک اس معاملے میں اصل سانحہ یہ ہوا کہ خلافت راشدہ میں جب عرب مسلمانوں نے عالم عجم کو فتح کیا، ان فتوحات کے نتیجے میں لاکھوں مربع میل پر پھیلی قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں میں پائے جانے والے لاکھوں بلکہ کروڑں غلام اسلامی معاشرے میں ایک دم داخل ہوگئے۔یہ واضح ہے کہ عرب معاشرے میں موجود ہزاروں غلاموں کو بیک جنبش قلم ختم نہیں کیا گیا تو یہ کام عجم کے لاکھوں غلاموں کے معاملے میں بھی ممکن نہ تھا۔صحابہ کرام نے اپنی حد تک یہ کام جاری رکھا مگر اول ان کی اصل توجہ جہاد کی طرف رہی اور پھر خلافت راشدہ کے نصف آخر میں مسلمانوں کا باہمی خلفشار شروع ہوگیا۔دوسری طرف وقت گزرنے کے ساتھ قرآن مجید کا فہم رکھنے والے اور اسلامی روح کو سمجھنے والے صحابہ کرام کی تعداد تیزی سے کم ہوتی گئی۔

یہاں تک کہ خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ کے دور میں جب باہمی جنگوں کا یہ سلسلہ تھما تو مسلم معاشرہ ملوکیت کی اجتماعی غلامی کا شکار ہوچکا تھا۔جو معاشرہ اجتماعی غلامی کا شکار ہو وہ انفرادی غلامی کے لیے کیا کرسکتا تھا۔چنانچہ سب نے غلامی کو ایک ناقابل تبدیل حقیقت کے طور پر قبول کرلیا اور رفتہ رفتہ غلامی کی لعنت کو مذہبی جواز بھی ملتا چلا گیا۔

پروفیسر محمد عقیل

بدگوئی

کہتے ہیں کہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلا ہوا جملہ واپس نہیں آ سکتے۔ ایک اور مثل مشہور ہے کہ زبان کا گھاو تیر کے وار سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اسی لئے بدگوئی کو عام طور پر انسانی معاشروں میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یوں تو کسی کی عزت پر حملہ کرنے اور اسے اذیت پہنچانے کے کئی طریقے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا طریقہ بدگوئی ہی ہے۔

بدگوئی کا مفہوم ہے کسی کے منہ پر اسے برا بھلا بولنا یا کوئی ایسی بات کر دینا جس سے اسے اذیت پہنچے۔ عام طور پر لوگ جب کسی کی مخالفت کرتے اور اس پر تنقید کرتے ہیں تو وہ بزدلی کی بنا پر پیٹھ پیچھے خفیہ طریقے سے اس کے عیوب بیان کرتے اور اس کی بے عزتی کے درپے ہوتے ہیں۔ اسے اصطلاح میں غیبت کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات اختلاف اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ لوگ منہ پر ہی مخالف کو برا بھلا کہنے لگ جاتے، اس پر نکتہ چینی کرتے، اس کے عیوب بیان کرتے، اس کی کمزوریوں کو اچھالتے، لعن طعن اور ملامت کرتے، طنزیہ فقرے چست کرتے اور یہاں تک کہ گالی بکنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔

یہ رویہ نہ تو دین میں پسندیدہ ہے اور نہ ہی دنیا کے اخلاقی معیار پر پورا اترتا ہے۔ اگر مخالف کمزور ہو تو اس کے نتیجے میں اس کی عزت نفس مجروح ہو جاتی اور نفسیاتی طور پر اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ اگر دونوں مخالفین ٹکر کے ہوں تو دیگر نقصانات کے ساتھ ساتھ بدمزگی رنجش میں اور رنجش دشمنی میں بدل جاتی ہے جس کا انجام انتقام در انتقام ہوتا ہے۔

قرآن و حدیث میں بدگوئی کی ممانعت

بدگوئی کے انہی نقائص کی بنا پر اس کی سختی سے قرآن و حدیث میں مذمت کی گئی ہے۔ قرآن میں سورہ الحجرات کی آیت میں واضح طور پر اس رویے کو برا سمجھا گیا اور اس کی ممانعت بیان کی گئی ہے اور باز نہ آنے والے لوگوں کو ظالموں کی صف میں شامل کیا گیا ہے۔

"اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو عیب لگاؤ اور نہ (ایک دوسرے کو) برے القاب سے پکارو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔اور جو توبہ نہ کریں تو وہی ظالم لوگ ہیں"۔(الحجرات ۴۹:۱۱)

سورہ القلم میں بھی طعنہ دینے والے شخص کے لئے وعید آئی ہے،(القلم ۸۶:۱۱)۔اسی طرح بدگو انسان کو سورہ الھمز ہ میں ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے۔

"ہر طعنہ زن اور عیب جوئی کرنے والے کے لیے ہلاکت ہے"،(الھمز ہ:۱۴۰۱)

قرآن کے علاوہ احادیث میں بھی بدگوئی کی واضح طور پر مذمت کی گئی ہے۔

"مسلمان کو اذیت نہ دو انہیں عار نہ دلاؤ اور ان میں عیوب مت تلاش کرو۔ کیونکہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیب جوئی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عیب گیری کرتا ہے اور جس کی عیب گیری اللہ تعالیٰ کرنے لگے وہ ذلیل ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ اپنے گھر کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔"(جامع ترمذی: جلد اول: حدیث نمبر 2121)

مسلمان کی عزت کی اس قدر حرمت ہے کہ جو کوئی اس حرمت کو نقصان پہنچائے ، اس کی نمازیں تک قبول نہیں ہوتیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"جو کوئی کسی مسلمان کی آبرو ریزی کرتا ہے تو اس پر اللہ فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوتی ہے اس کی ن کی فرض عبادت قبول نہیں ہوتی۔(صحیح بخاری: جلد دوم : حدیث نمبر 440)

یہ احادیث تو مومن کی عزت و آبرو پر عمومی انداز میں حرمت بیان کرتی ہیں۔ دوسری جانب

بداخلاقی اور بدگوئی کی شناعت کی بنا پر اس کے مختلف پہلوؤں کو احادیث میں موضوع بنایا گیا ہے۔ چنانچہ بدگوئی کا ایک اہم پہلو زبان کا غلط استعمال ہے اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" جو شخص اپنے دونوں جبڑوں کے درمیان کی چیز (زبان) اور دونوں ٹانگوں کے درمیان کی چیز (یعنی شرمگاہ) کا ضامن ہو تو میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں۔(صحیح بخاری: جلد سوم: حدیث نمبر 1421)

اسی طرح بدگوئی کے ایک اہم پہلو یعنی گالی کے بارے میں ایک حدیث میں بیان ہوتا ہے

"مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے"۔(صحیح بخاری: جلد اول: حدیث نمبر 47)

ایسے ہی لعنت کرنے کو منع کیا گیا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن پر لعنت کرنا اس کے قتل کرنے کی طرح ہے"۔(صحیح بخاری: جلد سوم: حدیث نمبر 1058)

طعنہ زنی کو بھی ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

" کسی کے نسب میں طعنہ زنی کرنا اور میت پر نوحہ کرنا زمانہ جاہلیت کی خصلت ہے"۔(صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر 1082)

اسی طرح فحش گوئی سے پرہیز اور نرمی اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا:

" نرمی اختیار کرو، کج خلقی اور فحش گوئی سے پرہیز کرو"۔(صحیح بخاری: جلد سوم: حدیث نمبر 988)

انسان کو دنیا میں اپنی جنت بنانے کے لیے بھیجا گیا ہے مگر انسان دنیا ہی کو اپنی جنت بنانے میں مگن رہتا ہے

پروفیسر محمد عقیل

پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے

اصول نمبر 5۔ خود کو مصروف رکھیں

کیس اسٹڈی:

"وہ بڑی افسردگی سے اپنی داستان الم دوست کو سنا رہا تھا۔اس نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا اور پھر اپنی بات جاری رکھی: "میرا ایک سات سالہ بیٹا اور پانچ سالہ بیٹی تھی ۔ان سے میں بے حد محبت کرتا تھا۔اچانک میری بیٹی کو ڈنگی بخار نے آلیا اور کچھ ہی عرصے وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔اس کی موت کے بعد اللہ نے ہمیں ایک اور بچی سے نوازا لیکن پانچ دنوں کے اندر وہ بھی چٹ پٹ ہوگئی۔یہ دونوں نقصان میرے لئے ناقابل تلافی اور ناقابل برداشت تھے۔میرا امن وسکون رخصت ہو چکا تھا۔ مجھے نہ رات کو نیند آتی نہ دن میں آرام۔ بھوک پیاس کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ڈاکٹروں کے چکر لگائے تو کسی نے سکون آور ادویات تجویز کیں تو کسی نے سیر و تفریح کا مشورہ دیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میرا جسم شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہو اور وہ شکنجہ سخت سے سخت تر ہو رہا ہو۔

شب و روز اسی رنج والم کی کیفیت میں گذر رہے تھے کہ ایک دوپہر میرا بیٹا میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کے لیے ایک کشتی بنا دوں۔ میں اپنی پریشانیوں میں غلطاں تھا اور کسی کام کے موڈ میں نہیں تھا۔لیکن بیٹا بھی دھن کا پکا تھا۔اس کے مسلسل اصرار نے مجھے کشتی بنانے پر آمادہ کر ہی لیا۔ مجھے اس کے لیے کشتی بنانے میں تین گھنٹے لگے، جب کشتی مکمل ہوگئی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ تین گھنٹے جو میں نے کشتی بنانے میں صرف کئے وہ انتہائی انمول تھے۔گذشتہ کئی ماہ کے دوران یہی تین گھنٹے مجھے ملے تھے کہ جن کے دوران میرا ذہن تفکرات اور پریشانیوں سے آزاد رہا اور مجھے کچھ سکون میسر آیا۔اب مجھ پر یہ بھید کھل چکا تھا کہ اگر پریشانی، رنج اور الم سے بچنا ہے تو خود کو مصروف رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ میں گھر، دفتر اور دوست احباب میں مصروف رہنے کے لیے ایک منصوبہ بندی کی۔آج میں اتنا مصروف ہوں کہ میرے پاس پریشان ہونے کے لئے کوئی وقت نہیں"۔(ڈیل کارنیگی کی کتاب سے ماخوذ)

وضاحت

ہماری اکثر پریشانیوں اور غموں کا سبب فارغ اوقات میں بیٹھ کر اوٹ پٹانگ سوچوں کو ذہن میں جگہ دینا ہے۔فراغت میں کبھی آفس کی پریشانی یاد آتی ہے تو کبھی گھر کا کوئی مسئلہ۔مردوں کے برعکس خواتین کو اکثر اپنی ساس یا بہو سے متعلق سوچیں آتی ہیں جس سے ان کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ذہن میں آنے والی یہ سوچیں اگر اس قابل ہیں کہ انہیں حل کیا جائے تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو انہیں ٹالنے کا مشورہ دے گا۔لیکن اگر یہ سوچیں اس نوعیت کی ہیں کہ آپ ان کو حل کرنے کے لیے فی الوقت کچھ نہیں کرسکتے یا پھر یہ سوچیں ان مسئلوں پر مبنی ہیں جن کو حل ہی نہیں کیا جاسکتا تو ایسی صورت میں ان سے چھٹکارا پانا لازمی ہے۔ یہ لایعنی سوچیں اور ناقابل حل پریشانیاں اگر ذہن میں پلتی رہیں تو یہ آہستہ آہستہ دماغ کے کونوں کھدروں میں جگہ بنالیتی ہیں۔ان کی مثال کھٹملوں کی سی ہے

جو چارپائی کے ایک ایک انگ میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔اسی پر بس نہیں بلکہ اگر ان کا قلع قمع نہ کیا جائے تو یہ انڈے بچے دے کر اپنی نسل کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دیتے ہیں۔

ان سوچوں سے نجات کا ایک طریقہ یہ ہے کہ خود کو مصروف رکھا جائے اور غیر ضروری فراغت سے گریز کیا جائے۔ایک پروفیسر جیمز ایل مرسل کیا خوب کہتے ہیں:

"جب آپ مصروف ہوتے ہیں تب پریشانیاں اور تفکرات آپ پر حملہ آور نہیں ہوتے لیکن جب آپ کے کام کاج کے اوقات اپنے اختتام کو پہنچتے ہیں اس وقت آپ کا ذہن بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے ایک موٹر فارغ چل رہی ہو اور اس کی توانائی کہیں استعمال نہ ہو۔ایسی صورت میں یہ موٹر اپنے ہی پرزے جلا دے گی کیونکہ وہ بنا کسی لوڈ کے چل رہی ہے۔یہی حال ایک فارغ ذہن کا ہے۔اس لئے پریشانیوں اور تفکرات سے نجات کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ذہن کی موٹر کو کسی تعمیری کام میں مصروف رکھا جائے۔اتنا مصروف کہ یہ سوچنے کا بھی وقت نہ ہو کہ آپ خوش ہوں یا ناخوش"۔

مصروفیت کے لئے چند اہم نکات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔پہلی بات یہ کہ مصروفیت اس نوعیت کی ہو کہ اس سے آپ کا ذہن اور جسم دونوں مصروف رہیں۔جیسے اگر ایک عورت کپڑے تہہ لگے تو اس دوران میں اس کا دماغ مسلسل سوچوں میں غلطاں رہ سکتا ہے۔

اسی طرح مصروفیت مثبت اور تعمیری ہو۔مثال کے طور پر گھنٹوں بلا مقصد ٹی وی دیکھنا خود کو تھکانے کے مترادف ہے۔اسی طرح کسی لڑائی جھگڑے میں خود کو مصروف کرنا بھی کوئی مناسب تدبیر نہیں۔مصروفیت میں یہ بھی دیکھا جائے کہ اس سے کسی قسم کا ذہنی یا جسمانی نقصان تو وابستہ نہیں۔

مثبت مصروفیات میں جو امور شامل ہیں ان میں کسی کے کام آ جانا، کسی کھیل کود میں حصہ لینا، کسی سماجی سرگرمی کا حصہ بننا، کسی تحریر کا لکھنا، اولاد، بیوی یا شوہر کو وقت دینا، ماں باپ سے نیک سلوک کرنا، رشتے داروں کے مسائل نبٹانا، محلے کے اجتماعی مفاد میں اقدام کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ان کے علاوہ بھی بے شمار سرگرمیاں ہیں جو آپ اپنے ذوق کے مطابق منتخب کر سکتے ہیں۔

اسائنمنٹ

۔آپ جائزہ لیں کہ شب وروز میں کتنے گھنٹے آپ فارغ رہتے ہیں؟ پھر فراغت میں آنے والی پریشانیوں کی فہرست بنائیں۔

۔یہ دیکھیں کہ آپ کس طرح اپنی فراغت کو مثبت سرگرمیوں میں تبدیل کر سکتے ہیں؟

۔اگر آپ پہلے ہی سے ایک مصروف زندگی گذارتے ہیں تو تحریر کریں کہ آپ اپنی مصروفیت کو مزید مثبت کس طرح بنا سکتے ہیں۔

<u>ابو ہریرہ</u>

مطالعے کی عادت کیسے اپنائی جائے

اس سائنسی دور کی بہت ساری ایجادات مثلاً ٹی وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل فون وغیرہ نے انسانیت کو جہاں بہت سارے فائدے پہنچائے ہیں وہاں ان ایجادات کی وجہ سے انسان کا رشتہ کتابوں سے کمزور پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے آج کے انسان کے پاس معلومات کا ذخیرہ تو بہت زیادہ ہے لیکن وہ اُس حقیقی علم سے محروم ہوتا جارہا ہے جو اس کی دنیوی واُخروی زندگی کی کامیابی کے لئے انتہائی مطلوب ہے کیونکہ کتابیں آج بھی علم کا اصل ماخذ ہیں۔

یہ بات طے ہے کہ مطالعہ کا انسان کی زندگی پر گہرا اثر ہوتا ہے اور اس بات کا مشاہدہ ہماری روزمرہ زندگی میں مطالعہ کرنے والے اور مطالعہ نہ کرنے والے لوگوں کے عادات واطوار اور اخلاق وکردار میں واضح فرق کی صورت میں بھی کیا جا سکتا ہے اس لئے مطالعہ کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنایئے کیونکہ مطالعہ نا صرف ایک بہترین مشغلہ ہے بلکہ انسان کے فارغ اوقات کا بہترین مصرف بھی ہے اور اس مطالعہ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے علم کا عملی زندگی پر اطلاق کر کے ہم اپنی دنیاوی واُخروی زندگیوں کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔

ذیل میں کچھ تجاویز دی گئی ہیں جن پر عمل کرکے آپ مطالعہ کو اپنی زندگی کا جزو بنا سکتے ہیں۔

۔مطالعہ کی عادت کو اختیار کرنے کے لئے آغاز قرآن مجید کی تلاوت اور احادیث کے مطالعہ سے کیجیے اور اس کے لئے بہترین وقت نماز فجر کے بعد کا ہے۔شروع میں روزانہ صرف 10 منٹ مطالعہ کے ساتھ آغاز کیجیے لیکن اس کو ہر صورت باقاعدگی سے روزانہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس وقت میں سے بھی پہلے 5 منٹ قرآن مجید کی تلاوت کے لئے وقف کیجیے اور باقی 5 منٹ حدیث کی کسی کتاب کا مطالعہ کیجیے مگر اس میں ضروری بات یہی ہے کہ اس کام کو روزانہ بلاناغہ کیا جائے۔ کچھ ہی عرصے میں یہ عادت آپ کی زندگی کا حصہ بن جائے گی۔اس سے نا صرف آپ کا دین سے تعلق قائم رہے گا بلکہ کتاب اللہ اور حدیث رسول کا باقاعدہ مطالعہ تزکیہ نفس کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔ بصورت دیگر آپ وقت مقرر کرنے کی بجائے روزانہ کا ہدف بھی مقرر کر سکتے ہیں کہ قران مجید کے چند رکوع کی روزانہ تلاوت کی جائے اور ساتھ ہی احادیث کی کسی اچھی کتاب میں سے روزانہ فقط ایک یا دو احادیث کا مطالعہ کر لیا جائے۔مگر آپ اپنا روزانہ کا ہدف صرف اتنا مقرر کیجیے جو باسانی مکمل کیا جا سکے۔

اگر قرآن مجید کے عربی متن کی تلاوت کے ساتھ ساتھ ترجمہ و تفسیر بھی پڑھی جائے تو یہ اور بھی بہتر ہے اس کے لئے قران مجید کی کسی عمدہ مگر مختصر تفسیر کا انتخاب کر لیجیے۔ اسی طرح مطالعہ حدیث کے لئے کسی عمدہ کتاب کا انتخاب کر لیجیے ۔ امام نووی کی کتاب ریاض الصالحین احادیث کی ایک بہترین کتاب ہے جس میں فقہی مسائل کی بجائے فضائل اعمال اور تزکیہ نفس سے متعلق احادیث کو جمع کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب علماء کے ساتھ ساتھ عوام کے لئے بھی نہایت مفید ہے اس لئے اس کتاب کو ہر گھر میں ہونا چاہیئے۔اس کے علاوہ اربعین نووی بھی احادیث کی ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے۔

جب نماز فجر کے بعد مطالعہ کی عادت پختہ ہو جائے تو پھر آپ روزانہ مطالعہ کے وقت اور ہدف میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ اضافہ صرف اس حد تک کیجیے جس کے بارے میں آپ کو پختہ یقین ہو کہ آپ آسانی سے اُسے پورا کر سکیں گے۔

۔ اسی طرح قرآن و حدیث کے علاوہ دیگر موضوعات پر کسی اچھی اسلامی کتاب کا انتخاب کیجیے اور روزانہ صرف 10 منٹ مطالعہ کیجیے جس کے لئے بہترین وقت رات کو سونے سے پہلے کا ہے۔ اس مطالعہ کو اپنے معمول کا حصہ بنائیے اور آپ کتنے ہی تھکے ہوئے کیوں نہ ہوں 10 منٹ مطالعہ لازمی کیجیے جب آپ کی یہ عادت پختہ ہو جائے تو اس وقت کو آہستہ آہستہ بڑھاتے جائیے لیکن 30 منٹ سے زیادہ مطالعہ مت کیجیے بس اسی معمول پر مسلسل اور سختی سے عمل کیجیے۔

۔اسی طرح دیگر معلوماتی کتب کے مطالعے کے لئے روزانہ مختصر وقت مقرر کیجیے جن میں ایسی کتابوں کے مطالعہ کو اپنا معمول بنائیے جن کا تعلق آپ کی فیلڈ، انڈسٹری، تاریخ، تعمیر شخصیت، سائنس و ٹیکنالوجی، حالات حاضرہ یا آپ کی پسند کے کسی بھی موضوع سے ہو۔ ایسی کتابوں کے مطالعے کے لئے بہترین وقت آپ کے کام کرنے کی جگہ (workplace) یعنی دفتر، فیکٹری وغیرہ میں کھانے یا نماز کا وقفہ ہو سکتا ہے۔

۔ اپنی پسندیدہ کتابوں کی فہرست تیار کیجیے اپنے اردگرد لوگوں سے بہترین کتب کے بارے میں دریافت کیجیے اور جو کتابیں آپ کو دلچسپ معلوم ہوں ان کو اپنے پاس ایک فہرست میں محفوظ کرتے جائیے اور ان تمام کتب کا یکے بعد دیگرے مطالعہ کیجیے لیکن کوشش کیجیے کہ کوئی ضخیم کتاب اس فہرست میں شامل نہ ہو۔ کچھ ہی عرصے میں آپ بہت ساری بہترین کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہوں گے۔

۔کتابوں کا مطالعہ ایک بہترین مشغلہ ہے اس کو اپنے اوپر بوجھ نہ بنائیے بلکہ اس مشغلے سے لطف اندوز ہوں۔ دلچسپ کتابوں کا انتخاب کیجیے اپنی پسندیدہ کتابوں کو دوسروں کے ساتھ شئیر کیجیے اور ان کتب کے مطالعہ سے جو علم حاصل ہو اُس کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کیجیے۔مطالعہ کے لئے کسی پرسکون جگہ اور آرام دہ کرسی کا انتخاب کیجیے اور اس بہترین تفریح سے لطف اندوز ہوں۔

[نوٹ: مصنف کی درخواست پر مضمون ان کے **قلمی** نام سے شائع کیا جارہا ہے، ادارہ۔]

سوال وجواب

ابو یحییٰ

دنیا کی لذتیں اور دین پرعمل

سوال: محترمی ومکرمی

السلام علیکم

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ہمارا دل نہیں چاہتا کہ ہم دینی تعلیمات پر عمل کریں اور اللہ کی اطاعت کریں۔دنیا کی لذتیں ہمیں اس طرح کھینچتی ہیں کہ اچھا مسلمان بننا اور دین پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔کیا یہ ہمارے ایمان کی ناکامی ہے یا پھر ایک عارضی کیفیت ہے؟

نورین جاوید

جواب: السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

دیکھیے ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو آزمائش کے لیے بھیجا ہے۔ آزمائش اسی وقت ممکن ہے جب ہمارا دل ودماغ دنیوی لذتوں کی محبت رکھتا ہو، دین پر عمل کرنا نفس پر شاق ہو۔غور کیجیے کہ ہر وقت دل عبادت کا چاہے، اخلاقی اصولوں پر عمل کرنا بہت آسان

ہو، اللہ کی اطاعت کا راستہ بہت سہل ہوتو پھر آزمائش کیا رہی۔ پھر تو ہر شخص خود بخود نیکی کے راستے پر آ جائے گا۔ اس لیے یہ ہرگز ہماری ناکامی نہیں۔ ہماری اصل ناکامی یہ ہے کہ ہم نیکی کی راہ کو مشکلات، مفادات، خواہشات اور تعصّبات کی بنا پر چھوڑ دیں۔

ہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان پر مختلف مراحل آتے رہتے ہیں۔ کبھی نیکی کی طرف طبعیت خود ہی مائل ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ ان کی پروا کیے بغیر اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔ یہی کامیابی کا طریقہ ہے۔

والسلام

ابو یحییٰ

شوہر کے بانجھ پن کی وجہ سے دوسری شادی

سوال: السلام علیکم

انذار پر ایک بھائی نے سوال کیا ہے کہ کیا بیوی کے بانجھ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کی جا سکتی ہے۔ مجھے سوال اور آپ کے دیے ہوئے جواب دونوں پر ہی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے غصہ اس بات پر آتا ہے کہ ہماری عورتیں ایسے سوال کیوں نہیں کرتیں۔ کبھی کسی عورت نے یہ سوال کیوں نہیں کیا کہ مرد کے بانجھ ہونے کی وجہ سے اسلام عورت کو اجازت دیتا ہے کہ ایسے مرد کو چھوڑ کر دوسرے سے شادی کر سکتی ہے۔ آج میں آپ سے یہ سوال کرتی ہوں، اور میرا سوال بھی انذار میں شائع ہونا چاہیے، جس طرح ان بھائی صاحب کا شائع کیا ہے۔ میرے سوال کا عنوان بھی یہ ہونا چاہیے کہ مرد کے بانجھ پن کی وجہ سے عورت کی دوسری شادی۔ میرا نام نہ شائع کیجیے گا۔ (ایک بہن)

جواب: السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

نکاح کا تعلق مرد اور عورت کی رضامندی سے وجود میں آتا ہے اور اسی وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک دونوں کی رضامندی اس رشتے میں شامل ہو۔ اسلام عورت کو بھی یہ حق دیتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے یہ رشتہ نکاح ختم کرنا چاہے تو خلع لے کر علیحدہ ہوسکتی ہے۔ جو وجہ آپ نے بیان کی ہے یعنی مرد میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہونا وہ اس بنیاد پر خلع لے کر علیحدہ ہوسکتی ہے۔

تاہم ہمارے جس جواب کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے کہ عورت کے بانجھ پن کی وجہ سے مرد دوسری شادی کر سکتے ہیں، اُس میں اور اِس صورتحال میں یہ فرق پیش نظر رہے کہ مرد دوسری شادی کرے گا اور پہلی شادی بھی برقرار رہے گی۔ جبکہ خاتون کو پہلا رشتہ نکاح ختم کرنا ہوگا تبھی وہ دوسری شادی کرسکتی ہے۔ چنانچہ عورت کی دوسری شادی کا مطلب پہلے شوہر کو چھوڑنا ہوگا۔

باقی جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ عورتیں یہ سوال کیوں نہیں کرتیں تو اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔ اس راہ میں مذہب رکاوٹ نہیں بلکہ سماج رکاوٹ ہے جو عورت کے کیس کو ہمدردی کے ساتھ کم ہی دیکھتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ بڑھاپے میں ایک مرد اپنی بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کرلے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے بڑھاپے کا سہارا ڈھونڈا ہے اور اس میں کوئی چیز غلط نہیں۔ مگر ایک درمیانی عمر کی بال بچے دار خاتون شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی کرلے تو ہنگامہ ہوجاتا ہے کہ بڑھاپے میں شادی کیوں کی۔

ہمارا سماج اپنے پس منظر میں ایک قبائلی سماج ہے۔ قبائلی سماج عورت دشمن سماج ہوتا ہے۔ ایسے سماج میں عورتوں کے لیے انصاف ڈھونڈنے سے پہلے صدیوں کی ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سر دست یہ ذہنیت مغربی تہذیب کے زیر اثر بدل رہی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے اسلامی تعلیمات کے زیر اثر بدلا جائے۔ کیونکہ مغربی تہذیب آخر کار ایک دوسری انتہا پر لے جائے گی جبکہ حقیقی اسلامی تعلیمات اعتدال اور توازن کا نام ہے نہ کہ افراط وتفریط کا۔

والسلام

ابو یحییٰ

مضامین قرآن

ابو یحییٰ

قرآن مجید کا بنیادی مضمون: دعوت کے دلائل

پچھلے مہینے ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کے تین بنیادی مضامین ہیں:

۱) دعوت دین اور اس کے ردوقبول کے نتائج

۲) دعوت کے دلائل

۳) مطالبات

آج سے ہم ان میں سے ایک ایک پر تفصیلی گفتگو کرنا شروع کریں گے۔ مذکورہ بالا ترتیب کے لحاظ سے ہمیں سب سے پہلے دعوت دین اور اس کے ردوقبول کے نتائج سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہیے۔ تاہم ہمارا تاثر یہ ہے کہ اس معاملے میں سب سے کم کام دعوت کے دلائل پر ہوا ہے اور اسی حوالے سے لوگوں میں بہت کنفیوژن پایا جاتا ہے، اس لیے گفتگو کا آغاز اسی سے کیا جائے۔

دعوت کے دلائل

قرآن مجید کی بنیادی دعوت توحید، رسالت اور آخرت کی دعوت ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ ان بنیادی

معتقدات پر کسی تعصب یا جبر کی بنیاد پر نہیں بلکہ تعقل اور تفکر کی بنیاد پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ انسانوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ توحید، آخرت اور رسالت کی دعوت پوری طرح عقل و فطرت پر استوار ہے۔ اس کی جڑیں انسان کے اپنے وجود سے پھوٹتی ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تائید میں کھڑا ہے۔ مسلمہ علم کی روایت ہو یا انسانی تاریخ کا تسلسل، نظم کائنات ہو یا اس میں پائے جانے والے قدرت اور ربوبیت کے آثار ہر چیز انہی دلائل کی تقویت اور حمایت میں یک زبان ہے۔ انسانی ضمیر سے لے کر انفس و آفاق کی نشانیاں تک اس دعوت کی امین ہیں اور اس کے گواہ بھی۔ مذہب کی روایت ہو یا سابقہ کتابوں کی پیش گوئیاں سب اس دعوت کی تصدیق کرتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید کی دعوت کے دلائل محض مجرد الفاظ اور مبہم اشارات پر مشتمل نہیں بلکہ مسلمہ حقائق کے تفصیلی بیان پر مشتمل ہیں اور انتہائی منظّم انداز میں باقاعدہ مرتب ہیں۔ یہ دلائل آخری درجے میں یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ پیغام حق ہے اور اس کے سوا سچائی کہیں اور نہیں پائی جاتی۔

دلائل سے متعلق ایک اہم بات

ہم ابتدا ہی میں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کے دلائل کا یہ موضوع تفصیلی ہے۔ قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ انہی پر مشتمل ہے۔ ان دلائل کو جب تک ان کے پورے پس منظر کے ساتھ نہیں سمجھا جائے گا قرآن کی حجیت واضح نہیں ہوگی۔ مگر کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے چونکہ ہم مسلمان ہیں اور پہلے ہی ایمان لا چکے ہیں اس لیے یہ دلائل وغیرہ ہم سے غیر متعلق ہیں۔ اول تو ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے پیدائشی ایمان کو حقیقی ایمان بنائیں۔ ہم اپنے رب کی ذات، صفات، اس کے حضور پیشی اور اس کے پیغمبر کی ہستی کو کسی تعصب کی بنیاد

پر ماننے کے بجائے غور وفکر کے بعد مانیں اور ایمان کو اپنی ذاتی دریافت بنائیں۔تب ہی یہ ہوگا کہ ہمارا ایمان اللہ کی بارگارہ میں وہ قدر و قیمت پائے گا جس پر قرآن وحدیث کے سارے فضائل اور نتائج منحصر ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ نتائج کسی نسلی ایمان کا نہیں بلکہ حقیقی ایمان کا ثمرہ ہیں۔ یہی قرآن مجید نے اپنے پیروکاروں کو ''یا ایھا الذین آمنو'' کہا ہے یعنی ایمان لانے والے لوگو! اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایمان لایا جاتا ہے، یہ خود بخود نہیں آجاتا۔اور دلائلِ قرآن ہی وہ جن پر غور وفکر سے انسان حقیقی معنوں میں پورے شعور سے ایمان لاتا ہے۔

دوسری طرف ان دلائل کا مطالعہ تذکیر ومعارفت کے پہلو سے بہت اہم ہے۔یعنی جو سمجھنا چاہیں یہ ان کے لیے دلیل راہ ہیں اور جو ایمان لاچکے ہیں ان کے لیے اضافہ ایمان، معرفت حق اور تذکیر و یاددہانی کا ایک بڑا غیر معمولی ذریعہ ہیں۔اس لیے کوئی مسلمان یہ کہہ کر ان سے صرف نظر نہیں کرسکتا کہ ہم تو مان چکے ہمیں دلائل کی کیا ضرورت۔ یہ دلائل ہی نہیں بلکہ معرفت حق کی کنجیاں ہیں۔ان کو پڑھ کر اور ان پر غور وفکر کرکے ایمان بڑھتا ہے۔یہ اضافہ ایمان وہ چیز ہے جس سے کوئی مومن کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا ہے۔

دلائل قرآن ایک اجمالی خاکہ

اس قسط میں ہم توحید، رسالت اور آخرت کے ان دلائل کا ایک اجمالی خاکہ پیش کردیتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ اقساط میں ان میں سے ایک ایک کی قرآن مجید کی آیات و بیانات کی روشنی میں تفصیل کریں گے۔

الف: توحید کے دلائل

قرآن مجید میں توحید کی پانچ دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔

ا) دلیل ربوبیت

یہ دلیل بتاتی ہے کہ اس دنیا میں انسان کے لیے جو سامان زندگی بہترین طریقے پر میسر کیے گئے ہیں وہ زبان حال سے گواہ ہیں کہ اس درجہ متنوع کائنات میں ہم آہنگی پیدا کرکے زمین سے آسمان تک انسان کی ربوبیت کا اہتمام کرنے والی ایک ہی ہستی ہے اور وہی ہے جو انسان کے جذبہ پرستش اور بندگی کی تنہا حقدار ہے۔

۲) دلیل قدرت

اس دنیا میں قدرت کاملہ صرف ایک ہی ہستی کو حاصل ہے جو کسی کی محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔ ہر نفع وضرر اسی کے ہاتھ میں ہے۔اس لیے وہی مستحق عبادت ہے۔اس کے علاوہ جن کی پوجا کی جاتی ہے وہ کوئی قدرت نہیں رکھتے۔ وہ بے جان بت ہیں، کمزور اور محتاج انسان ہیں یا پھر وہ فرشتے ہیں جو خود کوئی قدرت اور طاقت نہیں رکھتے۔

۳) دلیل فطرت

انسانی کی فطرت اندر سے گواہی دیتی ہے کہ اس کا رب ایک ہی ہے۔ربوبیت کا یہ اقرار روز ازل سے اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دیا گیا ہے۔خواہشات اور تعصّبات کی بنا پر اس فطرت پر پردہ پڑ جاتا ہے،مگر مصیبت میں یہ پردہ پھٹ جاتا ہے اور انسان ہر طرف سے مایوس ہو کر ایک ہی رب کو پکارتا ہے۔یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک خدا ہی اصل معبود ہے۔

۴) نظم کائنات کی دلیل

انسان جس کائنات میں کھڑا ہے وہ بالکل متضاد اور متنوع عناصر کا مرکب ہے۔مگر مشاہدہ ہے کہ زمین وآسمان، خشکی و پانی، ہوا اور آگ جیسے متضاد عناصر ملتے ہیں اور بقائے زندگی کا وہ سامان (Life supporting System) فراہم کرتے ہیں جو ایک خالق کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ان کے خالق الگ الگ ہوتے تو اپنی مرضی سے ان متضاد عناصر کو کنٹرول کرتے اور یوں زمین میں فساد برپا ہو جاتا۔مگر یہ دھرتی فساد سے نہیں بلکہ زندگی کے حسن سے عبارت ہے۔

یہ ایک خالق کے وجود کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

۵) انسانی علم وروایت کی دلیل

انسان کا سفر توحید کی سیدھی شاہراہ سے شروع ہوا۔ انسان اس راہ سے بھٹک کر بارہا شرک کی تاریک راہوں میں نکل گیا لیکن توحید کی سیدھی راہ اپنی جگہ باقی رہی۔ ایک خدا کے سوا کتنے معبود بنے اور وہ کون تھے اس بارے میں بہت اختلاف ہے، مگر ایک خدا موجود ہے یہ انسانی روایت کی وہ وراثت ہے جس میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اصل تعلیم ابتدا ہی سے توحید کی تھی۔ باقی سب انحرافات تھے۔ مزید یہ کہ توحید کے حق میں تو آسمانی صحائف میں بہت کچھ پایا جاتا ہے، مگر شرک کے حق میں ان میں ایک دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کی حضرت عیسی جنھیں سب سے زیادہ بڑے پیمانے پر اللہ کا شریک بنایا گیا ان کی تعلیم بھی شرک کے بیان سے بالکل خالی ہے۔ یہی معاملہ انفس و آفاق اور فطرت انسانی کا ہے جس میں شرک کے حق میں کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

یہ توحید کے وہ پانچ دلائل ہیں جو قرآن پاک میں بار بار مختلف پہلوؤں سے دہرائے گئے ہیں۔ توحید کے یہ دلائل وجود باری تعالیٰ کی بھی دلیل ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں ایک جگہ براہ راست وجود باری تعالیٰ کی بھی دلیل دی گئی ہے۔ اسے ہم توجیہ کی دلیل کہہ سکتے ہیں۔

توجیہہ کی دلیل

اس دلیل کا استدلال یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی توجیہ چاہتی ہے۔ مگر خود اس کائنات کی کوئی توجیہہ انسان آج تک نہیں پیش کر سکا۔ کائنات کی واحد توجیہہ اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات والا صفات ہے جس کے نور سے دیکھا جائے تو آسمان و زمین کی ہر شے اپنے ٹھکانے پر نظر آئے گی۔ اس نور سے محروم ہونے کے بعد شرک کا سراب باقی رہ جاتا ہے یا پھر الحاد کا تہہ در تہہ اندھیرا۔ جس کے بعد کوئی روشنی ممکن نہیں۔

ب: رسالت کے دلائل

رسالت کے سات دلائل قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ رسالت ونبوت کا انسٹی ٹیوشن اب تا قیامت چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہی پر منحصر ہے اس لیے ہم دلائل اسی پس منظر میں بیان کررہے ہیں۔ گرچہ قرآن جب سابقہ انبیا کی دعوت کو بیان کرتا ہے تو ان کی سچائی کے دلائل بھی وہاں زیر بحث آجاتے ہیں۔ مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے کم وبیش وہی ہوتے ہیں جو نبی آخرزمان کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں۔

۱) کلام کا معجزہ

پہلی دلیل جو رسالت کے اولین مخاطبین کو دی گئی جو زبان و بیان کے ہنر میں یکتا تھے۔ انہیں چیلنج دیا گیا کہ اس کلام کو اگر گھڑا ہوا انسانی کلام سمجھتے ہیں تو اس جیسی کوئی ایک سورت بنالائیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والے کفار مکہ نے آپ کی مخالفت اور ایذا رسانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن کبھی اس چیلنج کا جواب دینے کی کوشش تک نہ کی۔ اس لیے کہ یہ ان کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ یہی اس کلام کے الوہی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

۲) سابقہ سیرت

نبوت کی دوسری دلیل خود سیرت مصطفیٰ تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان نبوت سے قبل اہل عرب کے درمیان ایک عام آدمی کی حیثیت میں چالیس برس رہے۔ اس بے مثل سیرت کے شخص کو وہ خود صادق وامین کہتے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ اخلاق کے پیکر ایک تاجر تھے جنہیں مذہبی مباحث اور شعر وادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر یہی ہستی ایک روز اچانک اعلان نبوت کرتی ہے اور مذہب اور ادب دونوں کی روایت کو لاجواب کردیتی ہے۔ سوائے اس بات کے کہ ان پر اللہ کا کلام اترا اس بات کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی کہ یہ انقلابی تبدیلی کیسے رونما ہوئی۔

۳) کلام کا ارتقا اور تضاد سے پاک ہونا

اگلا ثبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا ارتقا اور تضاد سے پاک ہونا ہے۔اس دنیا میں ہر مفکر، شاعر، دانشور کا ایک فکری ارتقا ہوتا ہے۔وہ کہیں نہ کہیں زانوئے تلمذ تہہ کرتا ہے۔وہ سیکھنے اور سمجھنے کے عمل سے گزرتا ہے۔وہ فکری درستی، ارتقا اور بہتری کے مسلسل ایک لازمی مرحلے سے گزرتا ہے۔اس عمل میں ممکن نہیں کہ اس کی فکر اور کلام تضادات سے پاک رہ جائے۔دنیا کے کسی عالم، مفکر، شاعر اور دانشور کو اس سے استثنا نہیں۔مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی وہ ہے جس نے سیکھے بغیر بہترین کلام دنیا کے سامنے پیش کیا جس میں نہ ارتقا آیا اور نہ کہیں تضاد پیدا ہوا۔یہ اس کا ثبوت ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں نہ کہ کوئی عام انسان۔

۴) ماضی کا درست اور تصحیح شدہ بیان اور مستقبل کی بالکل درست پیش گوئیاں

آپ نے نہ صرف ''اُمی'' ہونے کے باجود سابقہ کتابوں اور انبیا کے واقعات کو بیان کیا بلکہ وہاں جو کچھ تاریخی اور علمی غلطیاں تھیں ان کو چھوڑ کر صرف صحیح واقعہ سنایا۔ بارہا آپ نے اہل کتاب کے پوچھنے پر ایسے تاریخی واقعات پوری جزئی تفصیلات کے ساتھ بیان کر دیے جس کا علم عرب کے کسی شخص کو تھا ہی نہیں۔ بلکہ اہل کتاب میں سے بھی چند ہی علماء ان سے واقف تھے۔یہ علم خدا کے سوا آپ کو کوئی نہیں دے سکتا۔یہ آپ کے رسول اللہ ہونے کا ثبوت ہے۔

ماضی کے ساتھ آپ نے مستقبل کی بالکل درست پیش گوئیاں کیں جو جزئی تفصیلات کے ساتھ بالکل درست ثابت ہوئیں۔یہ پیش گوئیاں جن حالات میں کی گئیں ان میں ان کا پورا ہونا عملاً ناممکن تھا۔مگر وقت نے ان میں سے ہر ایک کو بالکل درست ثابت کیا۔اتنی صحت کے ساتھ واقعات بلکہ اقوام کے حالات کی پیش گوئیاں کرنا سوائے نبی کے کسی اور کے لیے ممکن نہیں جو خدا کے اذن ہی سے کلام کرتا ہے۔

۵) سابقہ کتابوں کی پیش گوئیاں

آپ کے وجود اور زندگی میں وہ سارے حالات جمع تھے جن کی پیش گوئی پچھلے صحیفوں اور انبیا کی تعلیمات میں ملتی ہے۔ آپ سے قبل نہ صرف آپ کے آنے کی پیش گوئی کی گئی تھی بلکہ کئی نشانیاں بھی بتا دی گئی تھیں۔ آپ کا وجود ان نشانیوں کے عین مطابق تھا۔ اس لیے اہل کتاب آپ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح لوگ اپنی اولاد کو پہنچاننے میں غلطی نہیں کرتے۔

۶) تعلیمات

آپ کی دعوت فطرت و اخلاق کے مسلمات، صالحین کی روایت، سابقہ مذہبی صحیفوں کی تعلیمات اور علم و عقل کی روایت کے عین مطابق ہیں۔ نیز آپ کا کلام ہر طرح کے انسانی اضافوں اور شیاطین کے اثرات سے مکمل طور پر محفوظ ہے۔ اس پس منظر میں یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آپ الوہی تعلیم کے آسمانی سلسلے ہی کا ایک حصہ ہیں نہ کہ اس سے جدا کوئی اجنبی۔ آپ کی تعلیم میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے فطرت اور اخلاق رد کریں یا علم عقل جس کے خلاف ہو۔ ڈیڑھ ہزار برس کے بعد بھی قرآن کا ایک بیان بھی علم و عقل کے مسلمات کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا۔ یہ آپ کی خدائی نسبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۷) رسولوں کی اقوام کا انجام

رسول اس دنیا میں حق کی دعوت ہی لے کر نہیں آتا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس دعوت کے رد و قبول کے نتائج کیا نکلیں گے۔ یہ نتائج آخرت کے حوالے سے بھی ہوتے ہیں۔ مگر دلیل رسالت کے پہلو سے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ دعوت کے رد و قبول کے نتائج کی اس دنیا میں بھی نکلنے کی پیش گوئی نہ صرف کی جاتی ہے بلکہ لوگ اپنی آنکھوں سے ان پیش گوئیوں کو پورا ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ رسول کے منکرین اس کی پیش گوئی کے عین مطابق عذاب کی زد میں آ کر

ہلاک کردیے جاتے ہیں اور ماننے والے زمین کے وارث بنادیے جاتے ہیں۔ یہ رسول کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

[جاری ہے]

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (5)

آتش فشانی میدان

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو زمین اچانک سیاہ رنگ اختیار کر گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے بہت سا تارکول اس پر گرا دیا ہو۔ ندی نالوں کے بل کھاتے راستے اس تارکول کے بیچ میں سے نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں کچھ سفید قطعات بھی تھے جس سے مجموعی طور پر زمین چتکبری نظر آ رہی تھی۔ بعض مقامات پر گول کھیت نظر آ رہے تھے۔ ایک آتش فشاں پہاڑ بھی نظر آ رہا تھا جو نیچے سے تو ایک پہاڑ تھا مگر اوپر سے ایک پیالے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

آتش فشاں جب پھٹتا ہے تو بڑی تباہی پھیلاتا ہے لیکن اس کے بعد یہ تباہی انسان کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ زمین کی تہوں سے زرخیز مٹی اوپر کی سطح پر پھیل جاتی ہے جو طویل عرصے کے لئے کھیتی باڑی کا کام دیتی ہے۔ یہی معاملہ انسان کی زندگی کا ہے۔ انسان پر کبھی بہت بڑی مصیبت آ جاتی ہے جس میں انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی اب ختم ہوئی کہ ہوئی۔ لیکن جب مصیبت کا یہ دور گزرتا ہے تو پھر سے آسانی اس کا مقدر بنتی ہے۔ مصیبت میں حاصل کیے گئے تجربات انسان کے لئے آسانی کے دور میں مفید ہوتے ہیں۔ مصیبت و آسانی

کیا ہے؟محض انسان کے لئے صبر وشکر کے امتحانات ہیں۔جس نے مصیبت میں صبر اور آسانی میں شکر کا دامن تھامے رکھا،وہ حقیقی زندگی میں کامیاب ہوگیا۔

ساحل کے ساتھ ساتھ ایک سیدھی لکیر مسلسل چلے جارہی تھی۔ یہ جزیرہ نما عرب کی ساحلی سڑک تھی جو جنوب میں یمن کی بندرگاہ عدن سے شروع ہوکر ساحل کے ساتھ ساتھ شمال میں اردن کی بندرگاہ عقبہ تک جاتی ہے۔ یہاں سے یہ شام کے دارالحکومت دمشق تک چلتی ہے۔دور جاہلیت میں قریش مکہ اسی راستے سے گرمیوں اور سردیوں میں تجارتی سفر کیا کرتے تھے جس کا ذکر سورہ قریش میں موجود ہے۔

سمندر کی تقسیم

میں نے اپنی سیٹوں کے درمیان موجود ہتھی کو اوپر اٹھا دیا اور اب کھلے ڈلے انداز میں آلتی پالتی مارے سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ تھکن نہیں ہوتی۔ اچانک میری نگاہوں کے سامنے ایک عجیب منظر آ گیا۔سمندر میں سے ایک بہت بڑی نہر نکل کر دائیں جانب جارہی تھی۔ یہ نہر نہیں تھی بلکہ اس مقام پر بحیرہ احمر دو حصوں میں تقسیم ہورہا تھا۔ایک حصہ خلیج عقبہ کہلاتا ہے اور دوسرا خلیج سویز۔اس منظر کو میں پہلے گوگل ارتھ پر دیکھ چکا تھا لیکن اپنی آنکھ سے اسے دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔خشکی پانی کے درمیان آگے بڑھ کر تکون سی بنا رہی تھی۔اس مقام کو "راس محمود" کہا جاتا ہے۔اب ہم سعودی عرب کی حدود سے نکل کر مصر کی حدود میں داخل ہورہے تھے۔ یہاں ساحل کے پاس سمندر کا رنگ ہلکا نیلا تھا جو کورل ریف کی وجہ سے تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ غوطہ خوری کیا کرتے ہیں۔

نیچے" جزیرہ نما سینا "نظر آرہا تھا جس کے جنوبی کونے میں" شرم الشیخ " کا شہر نظر آ رہا تھا۔ یہ ایسا شہر تھا جسے شرم چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ یہاں اہل مغرب اور بے حیائی میں ان کے

پیروکار اہل مشرق ساحلوں پر بے ہودگی کی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ اپنے پچھلے سفر میں ہم غلطی سے یہاں آ گئے تھے مگر اس کے ماحول نے ہمیں الٹے قدموں واپس مڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شرم الشیخ سے کچھ فاصلے پر جزیرہ نما سینا کا جنوبی کونہ نظر آ رہا تھا جو " راس محمد " کہلاتا ہے۔ مفسرین کا اندازہ ہے کہ سیدنا موسی و خضر علیہما الصلوۃ والسلام کی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ قرآن مجید میں اس مقام کو " مجمع البحرین " یعنی دو سمندروں کے سنگم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جزیرہ نما سینا کا منظر

تھوڑی دور جا کر ایسا محسوس ہوا کہ جہاز زمین کے قریب آ رہا ہو۔ ایسا نہیں تھا بلکہ زمین اٹھ کر جہاز کے قریب آ رہی تھی۔ ہم اس وقت مصر کے بلند ترین مقام سے گزر رہے تھے۔ یہ کوہ طور کا علاقہ تھا جہاں اللہ تعالی سیدنا موسی علیہ الصلوۃ والسلام سے ہم کلام ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل جو کئی سو سال کی غلامی کے باعث نہایت ہی پست اور غلامانہ ذہنیت کے حامل ہو چکے تھے، اللہ تعالی کے حکم سے اس صحرا میں قید کر دیے گئے۔ اس صحرا میں ان کی غلامانہ ذہنیت والی پوری کی پوری نسل فوت ہو گئی اور نئی نسل صحرا کے کھلے ماحول میں پل کر جوان ہوئی۔ اس نسل میں سیدنا یوشع اور کالب علیہما الصلوۃ والسلام جیسی جلیل القدر ہستیاں تھیں جنہوں نے فلسطین میں خالصتاً خلافت راشدہ قائم کی۔ اس کی تفصیل آپ میرے پچھلے سفرنامے " قرآن اور بائبل کے دیس میں " کے باب " جزیرہ نما سینا " میں دیکھ سکتے ہیں۔

[جاری ہے]

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب

ایمان باللہ اور اس کے اثرات

عن معاذ بن جبل رضی الله عنه قال كنت دف النبی صلی الله علیه وسلم لیس بینی وبینه الا موخرة الرحل فقال یامعاذ بن جبل فقلت لبیك یارسول الله وسعدیك ثم سار ساعة ثم قال یامعاذ بن جبل قلت لبیك یارسول الله وسعدیك ثم سار ساعة ثم قال یامعاذ بن جبل قلت لبیك یارسول الله وسعدیك۔ قال هل تدری ماحق الله عزوجل علی عباده قال قلت الله ورسوله اعلم قال فان حق الله علی العباد ان یعبدوه ولا یشرکوا به شیئا ثم سار ساعة ثم قال یامعاذ بن جبل قلت لبیك یاعسول الله وسعدیك هل تدری ماحق العباد علی الله اذافعلوا ذلك قلت الله ورسوله اعلم قال ان لا یعذ بهم۔ (بخاری ومسلم)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک سفر میں) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار بیٹھا ہوا تھا اور میرے اور آپ کے درمیان کجاوے کا صرف پچھلا حصہ حائل تھا۔ آپ نے فرمایا: اے معاذ بن جبل! میں نے کہا: حضور! غلام حاضر ہے، فرمائیے۔ (آپ نے سکوت اختیار فرمایا) پھر کچھ دور چلنے کے بعد پکارا: اے معاذ بن جبل! میں نے وہی لفظ دہرائے جو پہلی بار کہے تھے۔ (لیکن آپ نے کچھ نہیں کہا)۔ پھر کچھ دور چلنے کے بعد آپ نے پکارا: اے معاذ بن جبل! میں نے عرض کیا: حضور! غلام حاضر ہے، ارشاد فرمائیے۔ تب آپ نے فرمایا: تم جانتے ہو اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر علم رکھتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی بندگی کریں اور بندگی میں کسی غیر کو ذرا سا بھی ساجھی نہ بنائیں۔

پھر آپؐ نے تھوڑی دور چلنے کے بعد فرمایا: اے معاذ! اُس نے کہا: ارشاد ہو، یہ غلام آپؐ کی بات غور سے سنے گا (اور وفادارانہ آپؐ کی اطاعت کرے گا) آپؐ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہی خوب واقف ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ کی بندگی کرنے والے بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ انھیں عذاب نہ دے۔